بحث و نظر

کارل مارکس کی انسان دوستی

زیرِ نظر بحث ایک مسئلے کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش ہے۔ معاشی زبوں حالی کا شکار معاشروں میں زوال یافتہ اشتراکیت سے کچھ رومانوی سی یادیں وابستہ کی جا رہی ہیں۔ مسئلے کی نظریاتی اہمیت بھی ہے۔ اس لیے بہتر تفہیم کی خاطر پروفیسر عبدالقدیر سلیم اور سلیم منصور خالد دونوں کی تحریریں یکجا پیش کی جا رہی ہیں۔ بحث و نظر میں تحریریں مختلف نکتہ ہاے نظر کی نمایندگی کرتی ہیں۔ ترجمان القرآن کا ان سے اتفاق ضروری نہیں۔ (مدیر)

۱

عبدالقدیر سلیم

میرے عزیز بھائی سلیم منصور خالد نے ”عالمی سرمایہ داری کا مستقبل“ کے عنوان سے میری گزارشات (**ترجمان القرآن**‘ اکتوبر ۹۷) پر گفتگو کرتے ہوئے اس امر پر استدراک کیا ہے‘ کہ میں نے کارل مارکس کو ”انسان دوست“ کہا ہے۔

میں نے جدید سرمایہ دارانہ معیشت کے باوا آدم‘ ایڈم اسمتھ کے آزاد تجارت اور منڈی کی معیشت کے فلسفے کا مختصر تذکرہ کرنے کے بعد عرض کیا تھا کہ ”کارل مارکس نے انسانی معاشرے اور معیشت کا ایک زیادہ عمیق اور انسان دوست فلسفہ پیش کیا“۔ دوسری جگہ میں نے لکھا تھا کہ ”کارل مارکس اور اس کے پیش رو انسان دوست حکما نے سرمایہ داری کے ظالمانہ نظام اور اس کے بھیانک نتائج کے خلاف صداے احتجاج بلند کی تھی“---یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ میری اس رائے سے اتفاق نہیں رکھتے۔

کیا کارل مارکس (۱۸۱۸-۱۸۸۳) فی الحقیقت انسان دوست تھا؟ اس کے دل میں معاشرے کے غریب‘ محروم‘ پچھڑے اور مصیبت کے مارے ہوئے (wretched of the earth) لوگوں کے لیے کوئی درد تھا یا نہیں‘ اس کے بارے میں اس کے سوانح نگاروں کے ہاں بہت کچھ مل جائے گا۔ میں ان تفاصیل میں جانے کے بجائے اس کی زندگی کے چند نشانات کی طرف اشارہ کروں گا۔

مارکس یہودی نژاد تھا، لیکن عام عقیدے کے برخلاف اس کی ولادت ایک عیسائی گھرانے میں ہوئی، اور اسے عیسائی طریقے کے مطابق بپتسمہ دیا گیا۔ اس کا باپ ایک خوش حال قانون دان تھا، جس نے غالباً اپنے پیشے کی خاطر اپنے آبائی مذہب یہودیت کو ترک کر کے عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ تاہم وہ عصری ”روشن خیالی“ کی تحریکوں کا حامی تھا۔ وہ کانٹ کے عقل پر مبنی عقائد اور والٹیر کی روشن خیالی کا دل دادہ تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کارل مارکس کی اسی انداز میں تعلیم و تربیت کی۔ مارکس کی اوائل عمری کی تحریروں میں اس کی نسلی یہودیت (مظلومیت، محرومی اور پچھڑے ہوئے طبقے سے وابستگی) اور عیسائی عقیدے (انسانیت کی خاطر قربانی اور ایثار) کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔

اپنی علمی اور قلمی زندگی کا آغاز اس نے کولون (جرمنی) کے ایک اخبار میں اداریہ نویسی سے کیا، جس میں پس ماندہ اور مظلوم محنت کش طبقے کی حمایت کی جاتی تھی۔ اگرچہ اپنی صلاحیتوں کی بنا پر اس کے قلم کی بہتر مزدوری، نسبتاً بہتر اور کثیر الاشاعت اخبارات میں بھی مل سکتی تھی۔ اسے اپنے نظریات اور تحریکوں میں حصہ لینے کی پاداش میں جرمنی، فرانس اور پھر جرمنی سے نکالا گیا، اور آخر اس نے انگلستان میں پناہ لی، جہاں لندن میں برٹش میوزیم کے کتب خانے میں اس نے مطالعے اور تحریر کے لیے اپنا بیش تر وقت وقف کر دیا۔ اس کی توجہ اور تگ و دو اپنے اس معاشی فلسفے کی اشاعت اور اس کے لیے عملی جدوجہد میں مرکوز رہی، جس کے مطابق تاریخ کی توجیہہ ”طبقاتی کش مکش“ کی اصطلاحات ہی میں کی جا سکتی تھی۔

مظلوم اور محروم محنت کش طبقے کی وکالت اور اس کے لیے جدوجہد نے، اسے اپنے بیوی بچوں کی طرف توجہ دینے کی کم ہی فرصت دی اور وہ انھیں کبھی خوش حال آسودہ زندگی سے روشناس نہ کرا سکا۔ ۱۸۵۰ میں اس کے بیوی بچوں کو کرائے کے مکان سے نکال دیا گیا، اور اس کا سامان ضبط کر لیا گیا، کہ اس کے پاس کرایہ دینے کے لیے رقم نہ تھی۔ اس کے کئی بچوں کا انتقال اسی غربت اور بے کسی میں ہوا--- اس کے الفاظ میں: ”بورژوا طبقے کی مسلط کردہ فلاکت [نحوست] کی قربانی“ میں۔ یوں وہ ان دانش وروں سے بالکل الگ نظر آتا ہے، جو امیرانہ ٹھاٹھ باٹ اور آسایشوں کو قربان کیے بغیر نہایت آرام کے ساتھ غریبوں اور مظلوموں کی حمایت میں سرگرم نظر آتے ہیں، ان کے حق میں آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔

مارکس نے معاشرے کے مظلوم اور محروم طبقات کے لیے کسی بھی الہامی اور ماورائے عقل انسانی ہدایت کو واضح طور پر مسترد کیا ہے اور مذہب کو ”محنت کشوں کے لیے افیون“ قرار دیا ہے، جس کے ذریعے استحصالی طبقات انھیں مطمئن اور خوابناک غفلت میں رکھتے ہیں کہ وہ ان کے ظلم و ستم، ناانصافیوں اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف کھڑے نہیں ہو پاتے۔ اٹھارویں/ انیسویں صدی کے تناظر میں دیکھیں تو یہ حقیقت صاف نظر آتی ہے، اور اب بھی صورت حال اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، بقول اقبال۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

روایتی مذہبی طبقات نے انسانوں کو اپنی زبوں حالی کا خوگر اور اپنی قسمت کو "قسام ازل" کی تحریر باور کرانے میں استحصالی طبقات کی پوری پوری مدد کی تھی، اور کر رہے ہیں۔ اس طبقاتی گٹھ جوڑ کے خلاف مارکس کی تحریک "انسان دوستی" پر مبنی ہی نظر آتی ہے، اور اسی لیے اقبال نے نظریاتی اختلاف کے باوجود اس کی نیت (قلب) کو درست قرار دیا ہے، اگرچہ وہ اس کی فکر (دماغ) کو رد کرتے ہیں۔ وہ اسے "پیغمبر بے جبرئیل" قرار دیتے ہیں۔

صاحب سرمایہ از نسل خلیلؑ   یعنی آں پیغمبر بے جبرئیل
زانکہ حق و باطل او مضمر است   قلب او مومن، دماغش کافراست

(سرمایہ کا مصنف، جو ابراہیم خلیل اللہ کی نسل سے ہے، وہ پیغمبر بے جبرئیل ہے، اس کی فکر میں حق و باطل مخلوط ہیں، اس کا قلب تو مومن ہے، لیکن دماغ کافر [منکر حق] ہے)

اقبال نے مارکس کو "پیغمبر" اسی لیے قرار دیا (اگرچہ وہ ہدایت الٰہی سے محروم تھا) کہ پیغمبر کا کام ہی انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے چھڑانا ہے۔ ان کے کلام میں کئی جگہ اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو   کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے   کنجشک فرو مایہ کو شاہیں سے لڑا دو
حق را بسجودے، صنماں را بطوافے   بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو

اللہ کے آگے سجدہ ریز ہونا اور دوسری جانب خواہشات کے بتوں کو تراشنا، بقول اقبال حرم و دیر کا وطیرہ بن چکا ہے۔ کارل مارکس کا تصور مذہب بھی اسے اس طرف لے گیا کہ یہ استحصالی طبقات کا ممد و معاون ہے، لہٰذا اسے مسترد کر دینا چاہیے۔ مارکس کی مذہب بیزاری کا محرک اس کا "انسان دوستی" کا جذبہ ہی تھا۔ اسی طرح اپنی مشہور طویل نظم "خضر راہ" میں "سرمایہ و محنت" کے عنوان سے اقبال نے جس طبقاتی فہم کا اظہار کیا ہے، اسے بھی اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ اقبال کی اسلامی فکر سے وابستگی اور اشتراکیت کا استرداد ہر شک و شبہ سے بالا ہے، تاہم وہ کہتے ہیں۔

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے   خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر   شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی   اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش   اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ   خواجگی نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے   سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار   انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اسلام کو ایک مکمل نظام حیات سمجھنے والے اگر کارل مارکس کے استرداد مذہب کو اس روشنی میں دیکھیں، جن کا اظہار اقبال کے مندرجہ بالا اشعار اور متعدد مقامات پر ان کے کلام میں ہوتا ہے، تو یہ سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ وہ کیوں مذہب کو "برگ حشیش" اور "معجون خواب آور" سمجھ کر اس کی مخالفت کرتا تھا۔ وہ خود مذہب کے انقلابی تصور اور کردار سے ناآشنا تھا، اور شاید اسی لیے قابل معافی بھی ہے۔ غالباً اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوگی، کہ اس کے بعد اس کے فلسفے "مارکسیت" کے نام پر روس میں جو انقلاب آئے گا، اس میں پرولتاریہ [مزدوروں] کی آمریت، مارکس ازم، لینن ازم اور پھر اسٹالن ازم اور ماؤازم کے نام پر کیا گل کھلائے گی، اور زوال اشتراکیت کے بعد سرمایہ داری کس ظالمانہ شان کے ساتھ روس اور باقی دنیا میں ایک "ظہور نو" کا آغاز کرے گی۔

کارل مارکس کے مطلقاً استرداد مذہب کے دو بڑے نقصان ہوئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی فکر، مذہب کی اس طاقت سے محروم ہو گئی جو انسانوں کو کائنات کی خالق، حی ولایموت قوت سے وابستگی اور آخرت پر یقین کے ذریعے حرکت و نمو کے لامتناہی امکانات سے آشنا کرتی ہے۔ دوسری طرف مذہب اور خصوصاً اسلام پر یقین رکھنے والوں کے دل پر اس نے اس کی فکر کے لیے ایک پردۂ مزاحمت تان دیا ہے، کہ وہ اسے مکمل طور پر مسترد کر دینے کا رجحان رکھتے ہیں۔ اس پردے کو ہٹا کر دیکھا جائے تو شاید اس کی شخصیت سے بہتر آشنائی ہو سکے۔

۲

سلیم منصور خالد

انسانی تاریخ میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر خیر و شر کی قوتیں اپنا اپنا حصہ ادا کرتی چلی آئی ہیں۔ یہاں پر ظلم اور زیادتی کے مقابلے میں ہمدردی، احترام اور پاکیزگی کے نقوش زیادہ دیرپا ہوتے ہیں۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ "دانش، مومن کی گم شدہ میراث ہے"۔ اس لیے دانائی کی بات قبول کرنے کے لیے مسلمانوں نے کبھی اس چیز کو اپنے لیے نفسیاتی مسئلہ نہیں بنایا، کہ وہ کس مذہب یا کس عقیدے کے حامل فرد نے کہی---

ہاں، البتہ ان کا ضمیر اس معاملے میں یہ سوال ضرور اٹھاتا ہے کہ "یہ قرآن و سنت کی تعلیمات سے کس قدر قریب یا کتنا بعید ہے"۔ بس یہی ایک معیار ہے، جس پر کسی اصول، عمل یا نظریئے کو پرکھا جاتا ہے۔ یہ کلمہ طیبہ کے اقرار کا بنیادی تقاضا اور ایک حد فاصل ہے۔ اس لیے ایک مسلمان کبھی اس کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔

جہاں تک محترم پروفیسر عبدالقدیر سلیم صاحب کے مضمون میں مارکس کو "انسان دوست" فرد کے طور پر یاد کرنے کا تعلق ہے، اس بات پر ایک جملے میں ردعمل ظاہر کرنے کی چند بنیادیں ہیں، جنھیں پروفیسر صاحب جیسے صاحب علم و فضل، ایمان و عمل کے حامل اور صاحب دل فرد اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ مارکس کے وکیل صفائی ہیں اور نہ اس کی فکر کے خوشہ چیں۔ انھوں نے یہ جملے اپنی وسیع المشربی میں لکھے تھے، مگر غالباً اختصار کے باعث ان کا تاثر اضطراب انگیز تھا۔ ذیل میں دی جانے والی وضاحت صرف اس لیے ہے، کہ قارئین میں سے اگر کوئی فرد اس بات سے متاثر ہوتا ہے، تو اس کے سامنے حقائق تازہ رہیں۔ ضروری نہیں کہ اس وضاحتی استدلال سے اتفاق کیا جائے، مگر ان باتوں کو بیان کر دینا بہرحال ضروری ہے۔

انیسویں صدی کا مغرب ایک طرف بدترین استعمار کا مرکز اور دوسری جانب حریت فکر کا نقیب تھا۔ وہ ایک طرف مذہب کی عبا چاک کرنے کا علم بردار تھا تو اس کے ساتھ صنعتی انقلاب کا قائد اور اجارہ دار بن کر سامنے آیا تھا۔ مغرب کے اجتماعی ضمیر نے استعماریت، مذہب بے زاری اور خرد افروزی (یا عقلیت پسندی) سے تو کوئی زیادہ تکلیف محسوس نہیں کی۔ البتہ صنعتی انقلاب کے نام پر ہم وطن صنعت کاروں نے اپنے ہی ہم وطنوں کا لہو چوسنا شروع کیا، اس میں صنعت کار، سرمایہ دار اور بنکار سبھی شامل تھے۔ وہ بنکوں سے سرمایہ لے کر سود کی ادائگی اور نفع اندوزی کی خاطر انسانوں سے حیوانوں کی طرح کام لینے لگے، محنت کا معاوضہ نام نہاد تھا اور ریاستوں کا استعماری ڈھانچا ان کا پشتی بان بن گیا تھا۔ تب شدت سے یہ احساس پیدا ہوا کہ انسانی محنت ایک بے قدر چیز سمجھی جا رہی ہے۔

یہ وہ فضا تھی جس میں کارل مارکس کی صورت میں ایک دانش ور اس ظلم کے کاروبار پر تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ استحصال سے پاک معاشرے کے لیے طبقاتی کشمکش، نظریہ قدر زائد، پرولتاری آمریت اور مذہب سے بیزاری کا تصور پیش کرتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس کی کتاب "سرمایہ" کیمونسٹ پارٹی کا "منشور" (۱۸۴۸) اور "انٹرنیشنل" تشکیل پاتے ہیں۔ اس طرح دکھ، حسرت اور مجبوری میں کراہتے ہوئے مزدوروں کی دست گیری کے لیے، انسانی محنت کا استحصال ختم کرنے اور صنعتی ظلم کا پہیہ روکنے کے لیے وہ آگے بڑھتا ہے۔ مزدوروں کے اوقات کار، انسانی حدود میں آ جاتے ہیں اور پسے ہوئے طبقوں میں عزم و ہمت کی نئی قوت پروان چڑھتی ہے۔ ان کی مضمحل روحیں سکھ کا سانس لیتی ہیں۔ حقوق کے حصول کا طاقت ور تصور،

مزدور یونینوں کی شکل میں انقلابی تحریک بن جاتا ہے، اور پھر ۱۹۱۷ میں سب سے پہلی اشتراکی ریاست روس میں قائم ہو جاتی ہے۔ سرمایہ دار اور ان کی پٹھو حکومتیں، ان کمیونسٹوں کی قوت اور شعور سے لرزہ براندام ہو کر سوشل سیکورٹی اور فلاحی ریاستوں کے تصور کی جانب دیکھنے پر مجبور ہو جاتی ہیں، تاکہ ان کے ہاں کمیونسٹوں کو کامیابی نصیب نہ ہو۔ اس دفاعی حکمت عملی سے جہاں وہ اشتراکی انقلابیوں کے بڑھتے ہوئے قدم روکنے میں کامیاب ہوئے، وہاں ان معاشروں میں ایک عام انسان کے لیے بہتری اور سہولت بھی عام ہوئی۔ بیسویں صدی میں افریقہ، لاطینی امریکہ اور ایشیا کی محکوم قوموں نے برطانوی، فرانسیسی، ہسپانوی اور جرمن سامراج سے آزادی کی جدوجہد کی، تو ان میں سے اکثر تحریکوں کی اخلاقی مدد کمیونسٹوں نے کی (مگر ان کی یہ تائید تمام آزادی پسند قوموں کے لیے کبھی مخصوص نہ رہی) یہ وہ حقائق ہیں، جن سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ اور ان کا بالواسطہ کریڈٹ بہرحال کارل مارکس کو جاتا ہے۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود یہ بنیادی سوال باقی رہتا ہے کہ "کیا مارکس انسان دوست تھا؟"--- اس سوال کا جواب ہمیں مارکس کی پوری فکر، عمل، تحریک اور نتائج کی دنیا سے تلاش کرنا ہوگا۔ اگر مارکس کی شخصیت، افکار اور عمل کا جائزہ لیا جائے اور مارکس ازم کے چوہتر سالہ تجربے کو دیکھا جائے تو جواب "ہاں" کے بجائے "نہیں" میں آتا ہے۔

کسی بھی فلسفے یا اس کے علم بردار فلسفی کے افکار کا تجزیہ کرتے وقت، ادھوری یا نامکمل نہیں، بلکہ پوری تصویر کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ یہی منصفانہ اور علمی اسلوب ہے۔ اگر جزوی طور پر دیکھ کر کسی فرد کے مقام و مرتبے کا تعین کیا جا سکتا ہو، تو پھر امر واقعہ ہے کہ نازی جرمنی کا آمر مطلق ایڈولف ہٹلر (۱۹۳۴-۴۵) بھی انسانیت دوست قرار پاتا ہے۔ کیونکہ اس کی مسلط کردہ دوسری جنگ عظیم کے مابعد اثرات کے نتیجے میں ایشیا، لاطینی امریکہ اور افریقہ کی لاتعداد اقوام استعمار کی سیاسی غلامی سے نجات حاصل کر سکیں۔ پھر مسٹر گاندھی کو انسانیت دوست ماننا پڑے گا کہ اس نے لیو ٹالسٹائی کے فلسفہ عدم تشدد کو جدوجہد آزادی میں ایک موثر عملی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ لیکن مجموعی طور پر دیکھتے ہوئے ہم انھیں انسان دوست رہنما قرار نہیں دیتے۔ اسی طرح دیکھا جائے تو ہر فرد، چاہے وہ کتنا ہی ظالم کیوں نہ ہو، اس میں بھی کسی نہ کسی درجے میں رحم کا جذبہ پایا جاتا ہے، چاہے وہ اس قیمتی جذبے کو اپنے بچوں، اپنی برادری، اپنے ملک یا کسی خاص طبقے تک محدود رکھے۔ مگر ایک فطری انسانی حس کی بنیاد پر ہم اس فرد کو انسان دوستی کے مقام پر کھڑا نہیں کر سکتے۔ انسان محض طبقاتی، نسلی یا مذہبی امتیاز سے موسوم اکائی کا نام نہیں ہے، بلکہ اعلیٰ اخلاقی انسانی قدروں کی ترقی اور جائز آدرشوں کی تہذیب و نمو اور احترام آدمیت سے موسوم کرشمے سے مربوط فرد کا نام انسان ہے۔ جو چیز ان قدروں کو پروان چڑھائے یا جو رہنما ان اقدار کی ترقی کے لیے مجموعی طور پر کام کرے، وہ انسان دوست قرار پاتا ہے۔ افسوس کہ کارل مارکس، مزدور اور پسے ہوئے طبقات سے گہری دردمندی کے

جذبات رکھنے کے باوجود یہ مقام حاصل نہ کر سکا۔ کیونکہ مارکس محض ایک قلم کار یا فلسفی نہیں، بلکہ وہ خواب دکھانے اور خوابوں کی تعبیر بتانے والا فرد بھی تھا۔ اس لیے مارکس کے بارے میں رائے دیتے وقت ان امور کو ذہن میں رکھنا ہو گا۔ البتہ مارکس ازم کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے سب سے زیادہ خود مارکس نے، پھر مارکس کے مریدوں اور مارکسی علما نے بقدر استطاعت حصہ ادا کیا۔

براہ راست جائزہ لیں تو مارکسی فلسفے کا بنیادی دعویٰ (thesis) "طبقاتی کشمکش" ہے۔ انسانیت کو محض غریب اور امیر طبقے کی جنگ قرار دینا، درحقیقت دو انسانی طبقوں کے درمیان کشت و خون کرانے کی دعوت دینا ہے اور انسان کو مادی مفادات کی بنیاد پر تقسیم کرنا ہے۔ جس کے مطابق ایک وہ ہے کہ جس کے لیے سب کچھ ہے، مگر دوسرا وہ ہے جسے بالکل ختم ہو جانا چاہیے، یا ختم کر دینا چاہیے۔ یہ چیز انسانی فطرت سے دور اور حیوانی فطرت سے قریب تر ہے۔ جب انسان کو محض ایک معاشی حیوان تصور کر کے اجتماعی معاملات سوچے اور چلائے جائیں گے، تو بظاہر چند کامیابیاں حاصل کر لینے کے باوجود فی الحقیقت وہ امور نوع انسانی کو پھاڑنے، نفرت ابھارنے اور درندگی کی حس کو تیز کرنے کا باعث بنیں گے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس طرح ایک طبقے کو فوقیت دینے اور دوسرے کی مکمل نفی کرنے کے بعد بھی فیض یافتہ لوگ سکون حاصل نہ کر سکے، بلکہ انسانیت ایک دوسرے عذاب میں مبتلا ہو گئی۔ جس کے تحت آزاد دنیا کے ظالم صنعت کار سے قدم ملاتا ہوا سرخ جنت کا ظالم بیورو کریٹ کہیں درجے زیادہ ظالم ثابت ہوا، کہ جس کی مار کھا کھا کر مزدور کو تڑپنے کی بھی اجازت نہ ملتی تھی۔

مارکسی "نظریہ قدر زائد" کی فلسفیانہ موشگافیوں سے قطع نظر، اس پر عمل کرنے کی ابتدا یہ قرار دی گئی کہ "محنت صلاحیت کے مطابق اور معاوضہ ضرورت کے مطابق" مگر یہ دعویٰ بھی ایک خوش کن اور ادھورے خواب سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اشتراکی ریاست میں تعلیم اور صحت مفت اور سفر نہایت سستا میسر آیا۔ لیکن مارکس ازم کوئی ایسا اخلاقی نظام پیش نہ کر سکا، کہ جس سے فرد کی داخلی دنیا میں ہمدردی، ذمہ داری اور دیانت کی اعلیٰ قدر کو بیدار کیا جا سکتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مارکسی معاشرہ مقابلے کے فطری جذبے سے عاری اور ذمہ داریوں کی ادائیگی کے احساس سے تہی دامن ہوتا چلا گیا۔ ریاستی وسائل، شہریوں کے لیے محض افیون ثابت ہوئے اور اس طرح ان کی انفرادی اور اجتماعی قوت کار کو گھن کی طرح چاٹنے لگے۔ اشتراکی روس، محکوم قوموں (وسطی ایشیا، قفقاز، ماورائے قفقاز، بالٹک ریاستوں اور مشرقی یورپ وغیرہ) کے معدنی وسائل اور خام مال کی لوٹ کھسوٹ سے اپنی سامراجی فطرت کی تسکین کرتا رہا، اور یوں ایک حد تک اس کا بھرم قائم رہا، مگر آخر کار بے نقاب ہو کر رہا۔ انسانوں کو تب معلوم ہوا کہ انسانی فطرت سے ٹکرانے والے اس نظریے نے ریاست کی چولیں تک ہلا دی ہیں۔

مارکس نے "پرولتاری آمریت" (یعنی مزدوروں کی حکومت کے قیام) کا نظریہ دیا۔ یہ کتنا خوش نما نعرہ تھا کہ "دنیا بھر کے مزدورو، ایک ہو جاؤ"۔ لیکن افسوس کہ ایک چوتھائی دنیا کے مزدور ایک ہونے کے باوجود سکھ اور چین کے وہ ثمرات نہ پا سکے، کہ جن راستوں پر چل کر مارکس نے ایسے پھل پانے اور کھانے کی بشارت دی تھی۔ مزدوروں کی ایک قلیل جماعت نے سب سے پہلے، اسی انقلابی جذبے کے تحت برتر طبقے کے خون سے ہولی کھیلی، اور پھر بچ جانے والے مزدور، کسان طبقے کی گردن پر پیر تسمہ پا بن کر سوار ہو گیا۔ "مزدور کبھی غلطی نہیں کرتا، مزدور ہی انسانیت کا محافظ اور پشتی بان ہے" وغیرہ قسم کے جملوں کے جلو میں اس مزدور جماعت نے ایک اعلیٰ مزدور طبقہ بن کر ظلم اور درندگی کی نئی تاریخ رقم کی۔ اشتراکی انقلاب نے ہم وطن انقلاب دشمنوں سے فارغ ہونے کے بعد، ذرا سا اختلاف کرنے والے ہم وطن "انقلاب کے بیٹوں" کو کھانا شروع کیا۔ کبھی اسے "انقلابی جلاب" کہا گیا اور کبھی "ثقافتی انقلاب"۔ بہرحال وقفے وقفے سے انسانی جان و مال، عزت، آبرو، صلاحیت اور احترام آدمیت کا خون کیا گیا، جس سے نظر آنے لگا کہ "عمل، رد عمل اور امتزاج" غالباً اسی رویے کو کہتے ہیں۔ لطف کی بات دیکھیے کہ "مزدوروں" کی قیادت میں چلنے والی ان ریاستوں میں مزدوروں ہی نے سب سے پہلے ہنگری میں ناکام اور پھر پولینڈ میں کامیاب بغاوتیں کیں۔ بعد ازاں مشرقی یورپ، اشتراکیت سے ہمہ گیر بغاوت کا مرکز ثابت ہوا۔ افسوس کہ اس بغاوت میں وہاں کے فوجی اور دانش ور، صحافی اور پروفیسر حضرات کوئی قابل قدر حصہ ادا کرنے سے محروم رہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ وہاں کی فوجیں اپنے ہم وطنوں پر ان "مزدور حکومتوں" کے مظالم کی حصہ دار تھیں اور نتیجہ میں مراعات یافتہ۔ اسی طرح عظمت، دانش، امن، جمہوریت اور انسانیت کے نغمے الاپنے اور اپنی قوم کو خواب آور فکری گولیاں کھلانے والے یہ دانش ور ذاتی ترقی پسندی کے ہاتھوں مزدوروں کے استحصال پر خاموش اور ظلم کے نظام پر قانع تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مزدوروں کی آمریت میں چلنے والی ان ریاستوں میں، آخر مزدوروں ہی نے کیوں بغاوت کی؟

مارکس نے انسان دوستی کی معراج تک پہنچنے کے لیے مذہب اور اخلاقی تعلیمات کی یکسر نفی کی۔ کسی بالاتر ہستی کے وجود سے انکار نے انسانی فطرت میں چھپی ہوئی مفاد پرستانہ حس کو اس سراپا درندگی میں تبدیل کر دیا کہ جس کے نتیجے میں پھر دو طبقے وجود میں آگئے۔ مذہبی اخلاقیات کی جگہ مارکسی اخلاقیات نے لے لی۔ حصول مقصد یعنی طبقاتی کشمکش اور مزدوروں کی آمریت قائم کرنے کے لیے جھوٹ، فریب، قتل و غارت گری کو روا قرار دیا گیا۔ صدیوں سے موجود چھوٹی بڑی اخلاقی قدروں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا گیا۔ یہی عمل بنیادی طور پر "انقلاب" تھا۔ انقلاب فرانس (۱۷۹۹) کے نتیجہ میں مذہب سے بے زاری کی جو لہر چلی تھی، مارکس اور مارکس ازم کے ہاتھوں وہ ایک طوفان بلاخیز بن گئی۔ یہ چیز نوجوانوں کے لیے زیادہ مرغوب اور

اصحاب اقتدار کے نزدیک پسندیدہ ٹھیری۔ اس فلسفیانہ مارکسی نکتے نے مادہ پرستی کو نئے مذہب کا روپ دے دیا۔ جس میں دیوتا، روبل اور ڈالر تھے۔ پیغام بر مارکس، لینن (۱۸۷۰-۱۹۲۴)، اسٹالن (۱۸۷۹-۱۹۵۳) اور ماؤ (۱۸۹۳-۱۹۷۶) تھے، جبکہ مادی وجود رکھنے والے “فرشتے” خفیہ سروس، فوج، انتظامیہ اور مرکزی، مقامی، شہری یا قصباتی حکومتیں تھیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مارکس ازم جہاں بھی ہو گا، وہاں وہ مذہب اور بنیادی انسانی اخلاقی اقدار کی نفی کر کے خالص مادی اخلاقیات استوار کرے گا۔ جب تک پہلے سے قائم اخلاقی اقدار پر حملہ آور ہو کر وہ ان کا نام و نشان نہ مٹا دے، اس وقت تک مارکسی اخلاقیات پروان نہیں چڑھ سکتیں۔ یہ سچ ہے کہ ایک گیا گزرا مذہب بھی انسانی زندگی میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کا نقیب ہوتا ہے۔ باہر سے کوئی توجہ دلائے یا توجہ نہ دلائے، مگر خود اس مذہب کے ماننے والے لوگ ہی اپنی صفوں میں موجود گم راہ افراد کی نشاندہی کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ مارکس نے یہودیت اور عیسائیت کے گلے سڑے مذہبی ڈھانچے پر تیشہ چلاتے ہوئے، مذہب کی بنیادی اور انسانیت کی متفق علیہ اخلاقیات تک کو دریا برد کر دیا۔ جب یہ آگ آگے بڑھی تو اس کی تپش سے دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی بری طرح متاثر ہوئے، مگر مارکس اپنے ان متاثرین کو کسی برتر اخلاقی اور روحانی قدر کی ڈور نہ تھما سکا۔ اس المیے نے ان لوگوں کی داخلی زندگی میں زبردست خلا پیدا کیا۔ اس حقیقت کا اندازہ مادی سطح پر لگانا ممکن نہیں۔ جن کے دل پہ گزرتی ہے، اسے وہی رقم کر سکتے ہیں، مگر لفظوں اور حرفوں کی زبان میں نہیں، بلکہ آہوں اور حسرتوں کے روپ میں اپنی روحانی زندگی کا مرثیہ سنا سکتے ہیں۔

اگرچہ یہ بات براہ راست، زیر بحث مقدمے سے متعلق نہیں، تاہم توضیح مطلب کے لیے اس کا ذکر سود مند ہو گا۔ مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب نے احترام آدمیت کا جس طرح گلا گھونٹا، اس کی بڑی مثالوں میں گذشتہ تین سو برس کے دوران اس کا سامراجی عمل سب کے سامنے ہے۔ بیسویں صدی میں پہلی اور دوسری عظیم جنگوں کا ریکارڈ بھی نظروں سے اوجھل نہیں۔ ویت نام، افغانستان، فلسطین، مشرقی یورپ، چینی ترکستان اور جنگ خلیج (۱۹۹۱) کو بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ مگر سابق یوگوسلاویہ جیسی مارکسی ریاست کے سرب بیٹوں نے اشتراکی اقتدار سے آزادی پاتے ہی، بوسنیا ہرزے گونیا جیسی لبرل سی مسلم ریاست کے شہریوں پر جو مظالم ڈھائے، انھوں نے سبھی کو مات کر دیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ جس قوم (یعنی مسلمانوں) سے سبھی “انسانیت دوستوں” کو خون کی بو آتی ہے، اس قوم نے خون دیا، مظالم برداشت کیے، دفاع بھی کیا، پھر ان پر روا رکھی جانے والی ظلم و درندگی کی داستانوں نے پتھر دل انسانوں کی آنکھیں پرنم کر دیں۔ مگر پوری دنیا میں مسلمانوں کے کسی ملا، مولوی یا بنیاد پرست نے اس بنیاد پر انتقام کا نعرہ بلند نہیں کیا۔ نہ کسی گرجے کو نقصان پہنچایا اور نہ کسی کمیونسٹ کا بال بیکا کیا۔ ساتھ ہی مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں پر کیا کیا مظالم نہیں توڑے جا

رہے ہیں، مگر مسلمانوں نے کسی عام ہندو یا پنڈت سے انتقام نہیں لیا۔ یہ چیز دراصل اسلامی یا دینی اخلاقیات کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے، جس کی ناقدری کرنا بذات خود انسان دشمنی ہے۔

ایک بات بڑے اعتماد اور زور سے کہی جاتی ہے کہ "مارکس بے چارہ تو بے قصور ہے، مارکس ازم فی نفسہ انسانیت کا علم بردار ہے، مگر یہ لینن اور اسٹالن تھے، جنھوں نے اسے خراب کر کے نافذ کیا"۔ یہ بات محض عذر لنگ کے مترادف ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مارکس ازم کی بنیاد میں وہ جوہری خرابی تھی، جسے ہر دو اشتراکی "عالم" اور "مجتہد" بھی دور نہ کر سکے۔ ان تعلیمات کے نتیجے میں وہی کچھ ہونا تھا، جو ہو کر رہا۔ فرض کیجیے، کہ اگر جوزف اسٹالن، ولادی میر لینن اور ماوزے تنگ جیسے "کم فہم مارکس پسندوں" نے ہی مارکسی چشمہ صافی کو گدلا کیا تھا، تو پھر دنیا بھر میں مارکس کے عشاق، اس کی تعلیمات کے حافظوں، محافظوں اور متن کو سبقاً سبقاً پڑھنے والوں میں سے کسی قابل ذکر فرد کو بغاوت کر کے سامنے آنا چاہیے تھا۔ انھیں ڈنکے کی چوٹ پر فکر مارکس سے بے رخی پر تڑپنا اور دوسروں کو تڑپانا چاہیے تھا۔ مگر ایسی آواز، کسی جید مارکسی عالم نے بلند نہیں کی۔ بلکہ سبھی مارکسی حضرات ان محدود یا لامحدود اجتماعی فوائد کو مارکس کی تعلیمات پر صدق دل سے اعتقاد رکھنے اور قوت عمل کو تیز کرنے کا پھل قرار دیتے تھے۔

ہمیں مسلم دنیا کے عام سیکولر بلکہ خود دینی تعلیمی اداروں میں بھی قرآن اور حدیث کی تعلیم اس ہمہ گیر انداز سے نہیں دی جاتی، جس زبردست انداز سے مارکس کی تعلیمات، اس کے متن کے ساتھ اشتراکی ممالک میں پڑھائی جاتی تھیں۔ مگر یہ کیا بات ہے کہ کسی جید اور راسخ العقیدہ کمیونسٹ نے یہ اعتراض زوال اشتراکیت تک نہیں اٹھایا کہ "مارکس صاحب کے تعلیمات، افکار یا بنیادی کتب "سرمایہ" اور فکری امتزاج "منشور" کو نظرانداز کر دیا گیا ہے"۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ آدھا، پونا نہیں بلکہ پورا کارل مارکس اپنی تعلیمات اور تحریروں کے زور پر اشتراکی دنیا میں موجود رہا۔ اس کے باوجود انسان دوست مارکس کی تحریروں سے یہ ندا کیوں نہ بلند ہوئی کہ "مجھے میرے دوستوں بلکہ گورکنوں سے بچاؤ"۔ سائنس اور سماجیات کا ہر ذہین طالب علم اپنے اردگرد لینن ازم، اسٹالن ازم اور ماؤازم کی شکل میں جو کچھ دیکھ رہا تھا، اسے مارکس ازم کا عملی روپ ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس لیے مارکس ازم کے ان متوالے ممالک میں جب مزدوروں اور پسے ہوئے طبقوں نے بغاوت کا پرچم بلند کیا اور ان مجبوروں کے قدموں کی دھمک سے دھرتی کا دل دہلنے لگا، تو ہمیں کہیں کسی کونے سے بھی یہ آواز سنائی نہیں دی کہ "اصلی مارکس ازم نافذ کرو" یا "ہمیں ہمارا مارکس دو"۔ نہیں، بلکہ یہ لوگ مارکس کی تصویر پر تھوکتے، لینن اور اسٹالن کے مجسّموں کو جوتے مارتے دکھائی دیتے تھے۔ حالانکہ ان لوگوں نے سرخ پرچم کے سائے تلے ہی آنکھ کھولی تھی، انھوں نے مذہب کی "افیون" چکھی تک نہ تھی، مگر انھوں نے اپنے لہو کا وہ ذائقہ ضرور چکھ لیا تھا، جسے ان کے ہم وطن مارکسی ان کے جسموں سے

نچوڑ رہے تھے۔

مارکسی تعلیمات اور تشریحی جملے کتنے ہی خوب صورت ہوں، اور ان تعلیمات کے زیر اثر معرض تخلیق میں آنے والی تحریریں کتنی ہی خوش نما کیوں نہ ہوں۔ ان پر سر دھننے کے بجائے ہم یہ دیکھیں گے، کہ ان تعلیمات کے زیر سایہ جو ریاست وجود میں آئی، وہ انسان دوستی پر مبنی تھی یا انسانیت دشمنی پر استوار؟--- اس میں کیا شک ہے کہ اس اشتراکی ریاست کے وجود سے غیر اشتراکی دنیا کے صنعت کاروں، مہاجنوں، جاگیرداروں اور تاجروں پر ایک دہشت طاری تھی، جس کے نتیجے میں وہ ظلم کا راستہ اختیار کرنے کے باوجود کچھ ہچکچاتے اور ڈرتے تھے۔ انقلابیوں کی راہ روکنے کے لیے انھوں نے فلاحی ریاست اور سوشل سیکورٹی جیسے پروگرام شروع کیے۔

مگر جوں ہی اشتراکی روس زوال پذیر ہوا، نج کاری کے نام پر سرمایہ دار، پوری قوت سے اٹھا اور محنت کش اور عام صارف کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کے لیے میدان میں کود پڑا۔ آج، منڈی کی معیشت اور نج کاری کے ہاتھوں انسان تڑپ رہے ہیں، مگر چند صنعتی ممالک، پانچ ارب انسانوں کا لہو نچوڑ رہے ہیں، مگر کوئی ان کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہیں۔ اس صورت حال میں واقعی سوویت یونین کا وجود اپنی یاد دلاتا ہے۔ لیکن اپنی فطرت کے اعتبار سے اس کا وجود انسانی فطرت سے ٹکراتا اور محض ایک دہشت کی علامت تھا اور دہشت کبھی بھی اعلیٰ قدر کے طور پر تسلیم نہیں کی گئی۔ اس دہشت نے اگر فائدہ پہنچایا بھی تھا، تو فیض یاب ہونے والوں کو اس فائدے کی بہت بڑی قیمت چکانا پڑی تھی۔ لاکھوں انسان مارے گئے اور کروڑوں افراد محکومی کی زنجیروں میں جکڑے دم توڑ گئے۔ وہ لہو جو اشتراکی انقلابوں کو برپا کرنے کے لیے بہا، اور وہ خون جو اشتراکی انقلابیوں کو بچانے کے لیے بہایا گیا، بنیادی طور پر اس لیے تھا کہ "انسان کو معاشی استحصال سے بچانا ہے"۔ اس اعتبار سے اتنی بڑی انسانی قربانی لینے والوں سے، ہر بریدہ سر یہ سوال کرتا ہے کہ "ہمارے سروں کی فصل کاٹنے والو، تم نے ہماری اولادوں کو کیا دیا ہے؟" اس سوال کا مخاطب ہر کامریڈ ہے اور اس سوال کا مخاطب ہر مادہ پرست ہے۔ جن کے "مقدس اتحاد" نے نعروں اور سرابوں کی شدادی جنت آباد کی۔ مگر پوری دنیا کو سیاسی اور معاشی غلامی کے سوا کچھ نہ دیا۔

اشتراکیت کے انہدام کے بعد مارکسی تعلیمات کے حافظ اور اشتراکی تحریکوں کے علم بردار حضرات کا شعور مادہ پرستی کے دیوتا، ڈالر کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو کر رہ گیا ہے۔ انسانی ہمدردی کے نمایندہ مارکس کا عطا کردہ سارا فہم [دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹-۴۵) کی یاد تازہ کرتے ہوئے] مغربی استعماریوں، خاص طور پر امریکہ اور اس کے آلہ کار اداروں کی خدمت میں صرف ہونے لگا ہے۔ آج منڈی کی معیشت کی کالی دیوی انسانیت کی تذلیل کر رہی ہے، مگر مارکسی تعلیمات کے محافظ ذرا رک کر بھی ان مقہوروں اور مظلوموں کی